ترجمہ وتلخیص

امامتِ عظمیٰ کا قیام

علامہ ابن عبدالبر کی آراء کی روشنی میں

تحریر: ڈاکٹر عبداللہ بن ابراہیم الطریقی

ترجمہ: محمد جرجیس کریمی

امامت عظمیٰ اور سیاست شرعیہ اسلام کا اہم موضوع ہے اس پر علمائے اسلام کی بیش قیمت تحریریں موجود ہیں۔ ان ہی علماء میں علامہ ابن عبدالبر قرطبیؒ بھی ہیں جنھوں نے اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے ذیل میں اس کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے۔

حدیث سے متعلق علامہ موصوف کی دو کتابیں "التمہید لما فی الموطا من المعانی والاسانید" اور "الاستذکار الجامع لمذاھب فقہاء الامصار وعلماء الاقطار فیما تضمنہ الموطا من معانی الرائی والآثار" کافی مشہور ہیں۔ یہ اگرچہ مؤطا امام مالک کی شرحیں ہیں لیکن ان میں مختلف علوم وفنون کے موتی بکھرے ہوئے ہیں۔ ان ہی میں سیاست شرعیہ یا امامت عظمیٰ کا موضوع بھی ہے ہمیں خوشی ہے کہ الدکتور عبداللہ بن ابراہیم بن علی الطریقی نے اپنے ایک طویل عربی مضمون "آراء ابن عبدالبر فی الامامۃ العظمیٰ فی ضوء کتابیہ التمہید والاستذکار۔ عرض وتحلیل" میں یہ خدمت بحسن وخوبی انجام دی ہے جو ریاض کے مشہور عربی مجلہ دراسات اسلامیہ جلد ۱ شمارہ ۲ ۱۴۱۸ھ میں شائع ہوا ہے۔ مضمون کی طوالت کی وجہ سے اس کے لفظ بہ لفظ یا مکمل ترجمہ کے بجائے ذیل میں اس کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے ذیلی عناوین اور حوالے بھی اصل مضمون ہی سے ماخوذ ہیں۔

(مترجم)

امامتِ عظمیٰ کی اہمیت وضرورت

کوئی بھی صاحب عقل اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ انسان فطری طور پر ایک سماجی مخلوق ہے اور اس کے مصالح وضروریات دوسروں سے اس قدر مربوط ہیں کہ وہ تنہا زندگی گذارنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا لہٰذا اجتماعیت اس کی ایک فطری ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے چلانے کے لیے لازماً ایک نظام ہونا چاہیے۔ اسی وجہ سے شریعت اسلامی میں امامت عظمیٰ یا سیاست شرعیہ کا قیام دین کے اہم واجبات میں سے ہے جس کے بغیر دین کا قیام ممکن نہیں ہے۔

امامتِ عظمیٰ کے قیام کے مقاصد

کسی بھی صالح اجتماعیت کا قیام محض لوگوں کے جمع ہوجانے یا کسی وقتی، دنیاوی اور مادی ضرورت کی تکمیل کی غرض سے ممکن نہیں ہے اس کے لیے کسی مضبوط بنیاد اور اعلیٰ مقصد کی ضرورت ہے اسلام میں سیاست شرعیہ کا وہی مقصد ہے جو نبوت کا ہے یعنی خلق کے لیے سعادت کا حصول اور ان کے مصالح وضروریات کی تکمیل۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (الانبیاء: ۱۰۷)

اے نبیؐ! ہم نے تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید: ۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔

لہ السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ للامام ابن تیمیہ دارالکتاب العربی ص۱۶۹

فقہاء کرام نے اسلامی خلافت کا مقصد دین کی حفاظت اور دنیا کی سیاست بتایا ہے[1]۔ علامہ ابن عبدالبر ان تفصیلات کی روشنی میں اس کے درج ذیل مقاصد کا تعین کرتے ہیں۔

۱۔ عام دینی و دنیاوی مصالح کا حصول

امامت عظمیٰ کے قیام کا اولین مقصد ہر قسم کی دینی و دنیاوی مصلحتوں کا حصول ہے۔ اس لیے امام پر لازم ہوگا کہ وہ عید اور جمعہ قائم کرے، لوگوں کے معاملات کی نگرانی کرے، عدالتیں قائم کرے، مظلوم کی فریاد رسی کرے، عوام الناس کے درمیان معاشی انصاف کرے اور اگر کوئی لاوارث ہے تو اس کی سرپرستی کرے[2]۔ اس طرح دین کے اکثر احکام تقاضا کرتے ہیں کہ امامت عظمیٰ کا قیام عمل میں آئے۔ اس کے بغیر آدھی شریعت متروک ہو جاتی ہے اور صرف آدھی شریعت پر عمل ممکن رہ جاتا ہے[3]۔ مثال کے طور پر عدلیہ کا قیام، حدود و تعزیرات کا نفاذ، حج و جہاد پر عمل، ملک کا دفاع اور ریاست میں امن و امان کا قیام امام یا سلطان کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ امامت عظمیٰ کا قیام ایک دینی ضرورت ہونے کے ساتھ ایک دنیاوی ضرورت بھی ہے[4]۔

۲۔ مفاسد کا دفعیہ

جلب منفعت کی طرح دفع مضرت بھی انسان کی ایک فطری ضرورت ہے۔ اس کا سابقہ اس دنیا میں صرف اچھائیوں سے نہیں پڑتا ہے بلکہ وہ طرح طرح کے مفاسد سے بھی دوچار ہوتا ہے۔ ان کا دفعیہ انفرادی ضرورت کے ساتھ اجتماعی ضرورت بھی ہے اس لیے ایک اسلامی ریاست جلب منفعت کے ساتھ دفع مضرت کو بھی اپنے دستوری فرائض میں شمار کرتی ہے۔ فتنہ و فساد کا انسداد، سرحدوں کی حفاظت اور دشمنوں کا مقابلہ اس کے لیے لازم ہے۔ یہ چیز ایک صالح امامت کے بغیر

---

[1] الاحکام السلطانیہ للماوردی دارالکتاب العربی ص۲۹ وشرح المقاصد للتفتازانی تحقیق الدکتور عبدالرحمٰن عبدہ ۵/۱۳۲

[2] التمہید ۲۱/۲۷۵ [3] ایضاً ۱۱/ ۹۷

[4] ایضاً ۲۱/۲۵۲ والاستذکار ۲۲/ ۱۵۱

کیسے انجام پاسکتی ہے۔[1] انسانی اجتماعیت کا کوئی امام اور حاکم نہ ہو تو لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ کون کرے گا؟[2]

۳۔ احکامِ الٰہی کے مطابق فیصلے کرنا

اللہ تعالیٰ نے مختلف احکام نازل کیے ہیں۔ ان کا تعلق فرد سے بھی ہے اور اجتماعیت سے بھی، اجتماعی احکام کا نفاذ ایک سلطان کے بغیر ممکن نہیں ہے لہٰذا اسلامی ریاست کا ایک مقصد یہ قرار دیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو احکام نازل کیے ہیں ان پر عمل کیا جائے اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں وہ نافذ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا	پس اے نبیؐ تم اللہ کے نازل کردہ
أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ	قانون کے مطابق ان لوگوں کے معاملات
(المائدہ: ۴۹)	کا فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ: "حضرت علی بن ابی طالبؓ کا قول ہے کہ امام پر واجب ہے کہ وہ احکام الٰہی کے مطابق فیصلے کرے اور امانتیں ادا کرے۔ اگر وہ اپنے فرائض کو بخوبی ادا کر رہا ہو تو عوام الناس پر لازم ہوگا کہ اس کی اطاعت کریں اور جب وہ ان کو آواز دے تو لبیک کہیں۔[3]

۴۔ امت کی شیرازہ بندی

اسلام ساری انسانیت کا دین ہے اس کا مطمح نظر انسانیت کی شیرازہ بندی بھی ہے چنانچہ اسلامی ریاست کا ایک مقصد یہ ہے کہ لوگ الگ الگ گروہوں کی شکل میں زندگی گزارنے کے بجائے ایک وحدت بن کر زندگی گزاریں۔ یہی وجہ ہے کہ دین میں اختلاف و نزاع کو ناپسند کیا گیا ہے اور اتحاد و اتفاق پر بہت زور دیا گیا ہے۔

---

[1] التمہید ۲۱/۲۷۵ [2] ایضاً ۲۱/۲۸۲ - ۲۸۳

[3] الاستذکار ۲۳/۸۸

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا (آل عمران: ۱۰۳) — سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو

امام مالک بن انس نے مؤطا میں ایک حدیث روایت کی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے تین باتوں سے راضی ہوتا ہے اور تین باتوں سے ناراض۔ جن باتوں سے راضی ہوتا ہے وہ یہ ہیں کہ تم اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور اپنے سلطان کی خیر خواہی چاہو اور جن باتوں سے ناراض ہوتا ہے وہ ہیں قیل وقال کرنا، مال کو ضائع کرنا اور غیر ضروری سوالات کرنا۔[1]

حدیث مذکور کے حوالے سے علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ لوگوں کو اتحاد واتفاق پر سختی کے ساتھ قائم رہنے پر ابھارا گیا ہے۔[2] مزید فرماتے ہیں کہ حبل اللہ سے مراد جماعت[3] ہے جیسا کہ عبداللہ بن مسعودؓ کے ایک خطبے سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں لوگو! تمہارے اوپر سمع وطاعت اور جماعت کو لازم پکڑنا ضروری ہے کیونکہ جماعت ہی اللہ کی رسی ہے جسے پکڑنے کا اس نے حکم دیا ہے۔ گرچہ بعض اوقات جماعت میں ناگواریوں کا سامنا کرنا پڑے۔ ان کا انگیز کرنا تفرقہ بازی سے بہتر ہے۔[4]

اس بات کی تائید ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: تین باتیں ایسی ہیں کہ ان کے سلسلے میں کوئی مسلمان دھوکہ نہیں کھاتا۔ اول اس کا ہر عمل خالصۃً للہ ہوتا ہے، دوم وہ اپنے ذمہ داروں کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ سوم وہ ہر حال میں جماعت کو لازم پکڑے رہتا ہے۔[5] ایک اور حدیث میں ارشاد نبویؐ ہے کہ "جماعت رحمت ہے اور تفرقہ بازی عذاب"۔[6] حضرت حارث الاشعریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں تم لوگوں کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں

---

[1] المؤطا کتاب الکلام باب ماجاء فی اضاعۃ المال وذی الوجہین
[2] التمہید ۲۱/۲۷۲
[3] ایضاً ۲۱/۲۷۴
[4] ایضاً
[5] مسند احمد ۱/۱۸۳
[6] التمہید ۲۱/۲۸۱ اس حدیث کی تخریج امام احمد بن حنبل، طبرانی اور بزار نے بھی کی ہے۔

جن کا مجھے اللہ نے حکم دیا ہے وہ ہیں جماعت، سمع وطاعت ہجرت اور جہاد کو لازم پکڑنا[۱] ان تمام تفصیلات کی روشنی میں علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ اہل ایمان کا ایک نظام کے تحت متحد ہو کر زندگی گزارنا فرض وواجب ہے[۲] تاکہ امت ایک شیرازہ میں منسلک ہو کر دینی ودنیاوی سعادتوں سے بہرہ مند ہو سکے۔

امامت عظمیٰ کے قیام کی بنیادیں

سیاست شرعیہ دوسرے تمام سیاسی نظاموں سے بہت مختلف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاست شرعیہ دین کے پورے مجموعی نظام مثلاً عقائد، عبادات، اخلاق، معاشیات اور تعلیم وغیرہ کا ایک جزء ہے جبکہ دوسرے سیاسی نظاموں میں ان چیزوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا ہے۔ امامت عظمیٰ کی اساس چونکہ دین ہے اس لیے جن بنیادوں پر قائم ہو وہ دوسرے نظاموں سے کہیں زیادہ مستحکم اور مضبوط ہوتی ہے۔ علامہ ابن عبدالبر نے اس کی درج ذیل بنیادوں کا ذکر فرمایا ہے۔

۱۔ بیعت

بیعت اسلامی خلافت کے قیام کی اہم بنیاد ہے۔ اس پر اس کے گہرے اثرات ہوتے ہیں۔ بیعت کے معنی عہد وپیمان کے ہیں جو خرید وفروخت کرنے والے کی طرح بیعت کرنے والے اور سلطان کے درمیان ہوتا ہے یہ سمع وطاعت پر مبنی ہے۔ علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں کہ بیعت کی حقیقت جاننا ہر فرد پر لازم ہے تاکہ فرد اور سلطان کے درمیان تعلقات مستحکم رہ سکیں اور ان کے افعال واعمال عبث قرار نہ پائیں[۳]

علامہ ابن عبدالبر نے اس ذیل میں کافی شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور اس کی اہمیت، کیفیت، قسمیں اور لوازمات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے ذیل

---

[۱] مسند احمد ۴/۱۳۰ نیز دیکھئے التمہید ۲۱/ ۲۸۰

[۲] التمہید ۲۱/۲۸۲

[۳] مقدمہ ابن خلدون طبع پنجم ۱۴۰۲ھ ص ۲۰۹/۲۳۲

میں اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

بیعت کی اہمیت

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب ہم لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سمع و طاعت پر بیعت کی تو آپؐ نے فرمایا کہ حسب استطاعت تم پر سمع و طاعت لازم ہے[1] علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں اس حدیث سے رعیت سے بیعت لینے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس سے اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے[2]

بیعت کی کیفیت

علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور دیگر خلفائے راشدین سے بیعت لی۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر سمع و طاعت کا عہد لیا جاتا تھا اور یہ عہد تنگی و کشادگی اور ناسازگاری ہر حال کے لیے ہوتا تھا اور اس میں یہ بات بھی شامل ہوتی تھی کہ اس بارے میں حاکم سے جھگڑا نہ کیا جائے[3]۔ حضرت عبادہ بن صامت فرماتے ہیں کہ ہم لوگ بیعت کرنے کے لیے کھڑے ہوتے اور یہ عہد کرتے تھے کہ ہر حال میں حق بات کی اشاعت کریں گے اور اس بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کریں گے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے موقع پر فرماتے تھے کہ حسب استطاعت تم پر عہد کی پابندی لازم ہے کیونکہ اللہ نے کسی پر طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا ہے۔ بیعت لیتے وقت آپ صرف مردوں سے مصافحہ کرتے تھے۔ عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتے تھے[4] ایک حدیث حضرت جریر بجلیؓ سے مروی ہے کہ لوگوں سے بیعت لی جا رہی تھی۔ میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیعت کرنے کے لیے حاضر ہوا۔ میں نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسولؐ اپنا ہاتھ آگے بڑھائیے تاکہ آپ سے بیعت کرسکوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

---

[1] الموطا کتاب البیعۃ نیز دیکھئے البخاری کتاب الاحکام باب کیف یبایع الامام الناس۔

[2] التمہید ۱۶/ ۳۴۷ [3] ایضاً ص ۳۴۸ [4] ایضاً

"عہد کرو کہ صرف اللہ کی عبادت کرو گے، نماز کی پابندی کرو گے، زکوٰۃ ادا کرو گے، مسلمانوں کے خیر خواہ رہو گے اور مشرکوں سے دوستی نہ کرو گے"[۱]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ صلح حدیبیہ میں بیعت رضوان کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "حضرت عثمانؓ نے اللہ اور اس کے رسول کی خاطر اپنی جان کو خطرہ میں ڈالا ہے۔ لہٰذا اس کا مقابلہ کرنے کے لیے میں بیعت کرتا ہوں چنانچہ آپؐ نے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ بیعت کی کیفیت یہی ہے کہ مصافحہ کے طریقے پر ہاتھ سے ہاتھ ملا کر عہد کیا جائے"[۲]

بیعت تحریری شکل میں بھی ہو سکتی ہے جیسا کہ عبداللہ ابن عمرؓ نے عبدالملک بن مروان کو خط لکھا کہ "میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں اور میں کتاب و سنت کے مطابق حسب استطاعت سمع و طاعت کا اقرار کرتا ہوں"[۳]

کم عمر بچوں سے بھی بیعت لی جا سکتی ہے جیسا کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے حضرت عمرو بن عطیہ سے بیعت لی تھی۔

عمرو بن عطیہ بیان کرتے ہیں کہ "میں بچہ تھا اور میں نے حضرت عمرؓ سے کتاب و سنت پر قائم رہنے کی بیعت کی۔ میں نے عرض کیا کہ ہمارے درمیان کتاب و سنت کے مطابق ہر معاملے کا فیصلہ ہوگا چاہے وہ ہمارے موافق ہو یا مخالف۔ حضرت عمرؓ اس بات پر ہنس پڑے اور بیعت کر لی"[۴]

خلاصۂ کلام یہ کہ بیعت ایک عہد ہے۔ بیعت کرنے والے اور بیعت لینے والے کے درمیان کہ وہ ہر معاملے کا فیصلہ شریعت کے مطابق کریں گے اور سمع و طاعت و نصح و خیر خواہی کی روش پر قائم رہیں گے۔ جہاں تک محض عہد و پیمان کا تعلق ہے جو مروجہ طریقے پر سلطان اور رعایا کے درمیان ہوتا ہے تو اس کا شریعت کے نظامِ بیعت

---

[۱] ایضاً ص ۵۰-۳۴۹ نیز دیکھئے مسند احمد ۴/۳۶۵

[۲] ایضاً ص ۳۵۲ نیز دیکھئے سنن ابوداؤد کتاب الجہاد باب فیمن جاء بعد الغنیمۃ لا سہم لہ

[۳] الموطا کتاب البیعۃ

[۴] التمہید ۱۶/۳۵۴ الاستذکار ۲۷/۲۹۴ ۴۳۴

سے کوئی تعلق نہیں ہے البتہ ایسا حکمراں شرعی احکام کے نفاذ کا عہد و پیمان باندھے تو اس کے جواز کی صورت نکل سکتی ہے[1]

بیعت کی قسمیں

علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ بیعت مختلف باتوں پر ہو سکتی ہے جیسے قتال، ہجرت، سمع وطاعت اور عام اسلامی تعلیمات پر تعامل۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان میں سے ہر نوعیت کی بیعت کا ثبوت موجود ہے۔ مثال کے طور پر صلح حدیبیہ کے موقع پر بیعت رضوان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے آخری دم تک لڑنے کی بیعت لی تھی۔ اسی طرح مدینہ ہجرت کر جانے کے بعد آپؐ نے مسلمانوں سے ہجرت کی بیعت لی مؤطا کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام پر قائم رہنے کی بیعت کی تھی۔ حاصل بحث یہ کہ بیعت کسی وقتی اور ہنگامی ضرورت کے تحت بھی ہو سکتی ہے اور مستقلاً دین پر قائم رہنے اور کتاب وسنت کے مطابق سمع وطاعت پر بھی۔ دونوں صورتیں جائز ہیں[2]

بیعت کے لوازم

بیعت ایک عہد ہے اور عہد کی پاسداری کا شریعت نے حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ (المائدہ: ۱) — اے لوگو جو ایمان لائے ہو عقود و پیمان کی پوری پابندی کرو۔

علامہ طبری فرماتے ہیں کہ اہل ایمان کو مخاطب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارا خدا اور رسول پر ایمان سچا ہے تو تم اس کی بات کو مانو اور عہد کو پورا کرو۔ اس میں مومن

---

[1] التمہید ۱۶/ ۳۴۸ ومقدمہ ابن خلدون ص ۲۰۹

[2] التمہید ۱۲/ ۲۲۵ - ۲۶۶، نیز دیکھئے الامامۃ العظمیٰ عند اہل السنۃ والجماعۃ للشیخ عبداللہ الدمیجی طبع دوم ۱۴۰۹ھ ص ۲۰۰، الموطا کتاب الجامع ۴۳۵

اور خدا اور رسول کے درمیان کیا ہوا عہد بھی مراد ہے اور اپنے جیسے انسانوں سے کیا ہوا عہد بھی[۱]

عام قسم کا عہد طرفین کی رضامندی سے منسوخ ہوسکتا ہے لیکن بیعت کے بارے میں علامہ ابن عبدالبر کی رائے ہے کہ ایک بار منعقد ہوجانے کے بعد وہ منسوخ نہیں ہوسکتی ہے۔ اس کا ثبوت ایک دیہاتی کے واقعہ سے ملتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس دیہاتی کو مدینہ کی آب وہوا راس نہ آئی اور وہ بخار میں مبتلا ہوگیا تو وہ شکایت لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور بیعت کے فسخ کا مطالبہ کیا۔ آپؐ نے اس سے انکار کردیا اس نے یہی مطالبہ متعدد بار دہرایا۔ آپؐ نے ہر بار انکار کیا پھر وہ شخص مدینہ چھوڑ کر چلا گیا اس کے باوجود آپؐ نے بیعت کے فسخ کا حکم صادر فرمایا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بیعت عام قسم کے عہد وپیمان سے مختلف ہے اور اس کا فسخ نہیں ہوسکتا ہے ہر حال میں اس کو پورا کرنا لازم ہے[۲]۔ علمائے اسلام نے اس کے درج ذیل لوازم کا ذکر کیا ہے۔

الف۔ سمع وطاعت

سمع وطاعت بیعت کے اولین لوازم میں سے ہے۔ اس کے بغیر اس کا وقوع ہو ہی نہیں سکتا چنانچہ شریعت نے بھی سمع وطاعت کی تاکید کی ہے حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں کہ ہم لوگوں نے رسول اللہ سے تنگی وکشادگی اور سازگاری وناسازگاری ہر حال میں سمع وطاعت کی بیعت کی اور اس بات کی بیعت کی کہ حاکم سے جھگڑا نہ کریں گے الا یہ کہ اس سے کھلے عام کفر کا صدور ہو اور یہ کہ ہم حق بات کی ہر حال میں اشاعت کریں گے اور اس سلسلے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کریں گے[۳]

---

[۱] تفسیر طبری ۹/۴۴۹ تحقیق محمود شاکر

[۲] التمہید ۱۲/۲۲۸

[۳] البخاری کتاب الاحکام باب کیف یبایع الامام الناس والموطا کتاب الجہاد ۴۳۶

علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ دین میں جو حلال ہے اور شریعت نے جسے جائز قرار دیا ہے وہ معروف ہے رسول اللہ کے ارشاد کا کہ سمع وطاعت صرف معروف میں ہے[1] یہی مطلب ہے۔ قرآن میں آپ کی ایک خصوصیت یہ بیان ہوئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم معروف کا حکم دیتے تھے۔ (الاعراف ۱۵۷) ارشاد ربانی ہے:

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ	جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں
وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ	سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی
(المائدہ: ۲)	کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ کی حدیث کے بارے میں حضرت خضیر سلمی نے ان سے سوال کیا کہ اگر ہم امیر کے ہر حکم کی اطاعت کریں تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟ حضرت عبادہ بن صامتؓ نے جواب دیا کہ اگر تم ایسا کروگے تو وہ تمہیں جہنم میں جھونک دیں گے[2] چنانچہ سمع وطاعت گرچہ بیعت کا لازمہ ہے۔ لیکن صرف معروف میں اس پر عمل کیا جائے گا معروف کے علاوہ امیر یا خلیفہ کی اطاعت جائز نہیں ہے[3]

ب۔ اذیت اور ناگواری پر صبر

لوازم بیعت میں سے ایک یہ ہے کہ اگر امیر یا خلیفہ کی طرف سے اذیت اور ناگواری کا سامنا کرنا پڑے تو اس پر صبر کیا جائے۔ جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

على المرء المسلم السمع	مسلمان آدمی پر (امیر کے حق میں) سمع
والطاعة فيما احب او كره	وطاعت لازم ہے چاہے اس سے مطلوب
الا ان يؤمر بمعصية فان	حکم بذات خود اسے پسند ہو یا نہ ہو۔ الا یہ کہ
امر بمعصية فلا سمع ولا	اسے معصیت کا حکم دیا جائے۔ ایسی صورت
طاعة[4]	میں سمع وطاعت لازم نہیں ہوگی۔

اس بارے میں اگرچہ علماء کا اختلاف ہے تاہم اکثروں نے اس کو اولیٰ قرار دیا ہے کہ امام

---

[1] ایضاً دیکھئے باب نمبر ۴
[2] الاستذکار ۱۴/ ۳۶ خضیر سلمی تابعی ہیں
[3] التمہید ۲۳/ ۲۷۷
[4] مسلم کتاب الامارۃ والتمہید ۲۳/ ۲۷۸

اور حاکم وقت کے ظلم وستم اور فسق وفجور پر صبر کیا جائے، اس کی سمع وطاعت کی جائے اور اس کے خلاف خروج نہ کیا جائے کیونکہ اس صورت میں اس کے فسق وفجور اور ظلم وستم سے زیادہ فتنہ وفساد کا اندیشہ ہے اور شریعت میں اس سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ سلف کے بعض واقعات سے اس کا عملی ثبوت ملتا ہے۔ یزید بن معاویہ سے بیعت کے وقت حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے فرمایا۔ اگر ان سے خیر کا صدور ہوگا تو ہم راضی برضا ہیں اور اگر شر کا صدور ہوگا تو صبر کریں گے[1] انھوں نے آئندہ زندگی میں اس کا عملی ثبوت پیش کیا بہت سے واقعات اور حوادث رونما ہوئے جن کو کسی بھی حال میں خیر نہیں کہا جا سکتا تھا مگر اس کے باوجود انھوں نے بیعت واپس نہیں لی اور سمع و طاعت کی روش پر قائم رہے۔

ج۔ امام اپنی ذمہ داری پوری کرے

بیعت کوئی ایک طرفہ معاملہ نہیں ہے کہ صرف بیعت کرنے والے پر سمع وطاعت لازم ہو بلکہ اس سے طرفین پر ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ بیعت کرنے والے پر معروف کے ساتھ سمع وطاعت اور بیعت لینے والے پر احکام الٰہی کے مطابق فیصلے کرنا ہے اگر کسی ایک طرف سے بھی اس کی پابندی نہ ہو تو ظاہر بات ہے کہ اس کا مقصد ہی فوت ہو کر رہ جائے گا[2]

۲۔ سمع وطاعت کی حدود

سمع وطاعت، بیعت کا لازمہ بھی ہے اور امامت عظمیٰ کی بنیاد بھی کیونکہ رعایا کی طرف سے سمع وطاعت نہ ہو تو امام تنہا کچھ نہیں کر سکتا ہے۔ اس لیے سمع وطاعت کے معنی اور اس کی حدود کا جاننا ضروری ہے۔ سمع کے معنی سننے کے ہیں اور طاعت کے معنی اس کے مطابق عمل کرنے کے ہیں۔ شریعت میں اس کے معنی کسی حکم کی حقیقت کو سمجھنے

---

[1] الاستذکار ۱۴/ ۴۱

[2] ایضاً ص ۳۷

اور اس کے مطابق عمل کرنے کے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا	اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کی
اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ	اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو
وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (النساء: ۵۹)	اور ان لوگوں کی جو تم میں صاحب امر ہوں۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا (البقرۃ: ۲۸۵)	ہم نے حکم سنا اور اطاعت قبول کی۔

سمع وطاعت بیعت کی شرائط میں سے ہے لیکن یہ مطلق نہیں بلکہ معروف کے ساتھ مقید ہے۔ امام اگر منکر یا معصیت کا حکم دے تو سمع وطاعت ساقط ہو جائے گی اور اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ علامہ ابن عبدالبر نے اس تعلق سے مختلف احادیث و واقعات کا ذکر کیا ہے ان میں سے چند یہ ہیں۔

حضرت ربیعہ بن یزیدؒ بیان کرتے ہیں کہ میں عبدالملک بن مروان کے دور خلافت میں ایک روز دمشق میں امام شعبی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اسی دوران کسی تابعی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب یہ قول نقل کیا ہے کہ "اپنے رب کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، اور امیروں کی اطاعت کرو خواہ وہ معروف کا حکم دیں یا منکر کا، اگر معروف کا حکم دیتے ہیں تو وہ تمہارے حق میں بہتر ہے اور اگر منکر کا حکم دیتے ہیں تو اس کا وبال انہی پر ہوگا اس کی ذمہ داری تم پر عائد نہ ہوگی۔ شعبی نے اس شخص کو جو یہ قول نقل کر رہا تھا ٹوکا کہ یہ جھوٹ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "معصیت اور منکر میں کسی کی اطاعت نہیں کی جائے گی"[1]

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے کسی امام سے بیعت کی اور اس نے اس کے ساتھ معروف کا معاملہ کیا تو چاہیے کہ وہ اس کی جہاں تک ہو سکے اطاعت کرے لیکن اگر اس نے معروف کے ساتھ اس کا معاملہ نہ کیا تو اس کی اطاعت لازم نہیں ہے۔ عبدالرحمن

---

[1] التمہید ۲۳/ ۲۷۷، ۲۷۸

بن عبد رب الکعبہ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے دریافت فرمایا کہ کیا یہ بات آپ نے خود رسول اللہؐ سے سنی ہے ؟ وہ یقین دلاتے ہیں کہ ہاں میرے کانوں نے سنا اور میرے دل نے اسے یاد رکھا۔ عبدالرحمٰن بن عبد رب الکعبہ سوال کرتے ہیں کہ پھر کیا بات ہے کہ آپ کے چچازاد بھائی معاویہ لوگوں کو حکم دیتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے کھائیں اور ایک دوسرے کی گردنیں اڑائیں جبکہ اللہ نے تو اس کے برعکس حکم دیا ہے۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا کہ تم اس کی وہ بات مانو جو اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق ہو اور اس کی وہ باتیں ماننے سے انکار کر دو جو اس کے خلاف ہوں[1]

علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ امام اگر معروف ومباح کا حکم دے تو اس کی اطاعت واجب ہوتی ہے چاہے بذات خود امام فاسق وفاجر کیوں نہ ہو[2]

۳۔ نصح وخیرخواہی

امامت عظمیٰ جن بنیادوں پر قائم ہوتی ہے ان میں سے ایک اہم بنیاد نصح و خیرخواہی ہے۔ نصح کے معنی خلوص کے ہیں[3] امامت عظمیٰ کے تعلق سے خلوص کے معنی یہ ہیں کہ امام اپنی امامت کو لوگوں پر ظلم وستم کا ذریعہ نہ بنائے اور اس پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں انھیں پوری کرے اور رعایا امام کی سمع وطاعت کسی مجبوری کے تحت یا بادل نخواستہ نہ کریں بلکہ پورے شرح صدر اور اطمینان قلب کے ساتھ اسے بجا لائیں وہ جو بھی کام کریں پورے خلوص کے ساتھ کریں۔ نصح وخیرخواہی امام پر بھی ضروری ہے اور رعایا پر بھی۔ ذیل میں اس کی تفصیل پیش کی جارہی ہے :۔

امام کی نصح وخیرخواہی

علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ امام پر واجب ہے کہ وہ اپنی رعایا کا خیرخواہ ہو

---

[1] التمہید صـ۲۸۰ [2] ایضاً صـ۲۷۹ [3] النہایۃ فی غریب الحدیث لابن الاثیر ۵/۶۳

جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

کلکم راع وکلکم	تم میں سے ہر ایک نگراں ہے اور
مسئول عن رعیتہ فالامام	ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے
الذی علی الناس راع علیہم	میں سوال کیا جائے گا امام عوام الناس
وھو مسئول عنہم [1]	کا نگراں ہے اور اس سے ان کے بارے
	میں جواب دہی کی جائے گی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی بھی امیر چاہے اس کی امارت میں صرف دس لوگ ہی کیوں نہ ہوں قیامت کے دن اس سے ان کے بارے میں سوال ہوگا [2] معقل بن یسارؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا "اللہ نے کسی کو ذمہ دار بنایا اور اس نے اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں جان بوجھ کر کوتاہی کی تو اس پر جنت حرام ہوگی" [3]

عبدالوارث بن سفیان روایت کرتے ہیں کہ حضرت معقل بن یسارؓ ایک بار بیمار ہوئے اور ان کی بیماری کچھ زیادہ بڑھ گئی تو زیاد ان کی عیادت کے لیے حاضر ہوا۔ معقل بن یسارؓ نے کہا کہ میں آپ سے ایک حدیث بیان کرنا چاہتا ہوں جس کو میں نے خود رسول اللہؐ سے سنا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو کوئی بھی لوگوں کا ذمہ دار (امام یا حاکم) بنایا گیا اور اس نے اپنی ذمہ داری نہیں نبھائی تو وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گا جبکہ اس کی خوشبو پانچ سو سال کی مسافت کی دوری ہی سے ملنے لگتی ہے [4]

رعایا کی نصح وخیر خواہی

جس طرح امام کے لیے اپنی رعایا کے حق میں نصح وخیر خواہی واجب ہے اس طرح رعایا کے لیے اپنے امام کے حق میں نصح وخیر خواہی لازم ہے۔ پیچھے یہ حدیث

---

[1] بخاری کتاب الاحکام باب قول اللہ تعالیٰ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم [2] الطبرانی فی الکبیر ۱۱/۴۱۱
[3] بخاری کتاب الاحکام باب من استرعی رعیۃ فلم ۴۲۱ [4] التمہید ۲۱/۲۸۸ نیز دیکھئے مسند احمد ۵/۲۷

گزر چکی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تم سے تین باتوں سے راضی ہوتا ہے ان میں ایک بات یہ ہے کہ اپنے سلطان کی خیر خواہی چاہو[۱] علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے امام کے حق میں نصح وخیر خواہی کے وجوب کا ثبوت ملتا ہے[۲] امام کی خیر خواہی کا ایک سادہ مفہوم یہ ہے کہ پورے اخلاص کے ساتھ اس کی سمع وطاعت کی جائے لیکن اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اگر امام کے اندر بعض کمزوریاں یا خامیاں موجود ہوں تو ان کو حکمت کے ساتھ دور کرنے کی کوشش کی جائے اس لیے کہ ہر حال میں حق بات کی اشاعت کا شریعت میں حکم دیا گیا ہے۔ علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ امت کا اس پر اتفاق ہے کہ برائی سے روکنا واجب ہے اگر ہاتھ سے اس کو روک سکے تو ہاتھ سے روکے اور اگر زبان سے روک سکے تو اس سے روکے اور اگر اس کا بھی امکان نہ ہو تو دل سے برائی کو برائی جانے[۳] سعید بن جبیرؒ نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے سوال کیا کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر واجب ہے لیکن اگر جان کا خطرہ ہو تو کیا کیا جائے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ایسی صورت میں واجب نہیں ہے[۴] علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ ایسی صورت میں امام کے حق میں دعا کرنی چاہیے کہ اس کی اصلاح ہو جائے اور جب تک اصلاح نہیں ہوتی صبر کرتے ہوئے سمع وطاعت پر قائم رہنا چاہیے[۵] آدمی کو اپنی جان کا خطرہ ہو تو حق بات کے اظہار میں خاموشی جائز ہے لیکن امام کی خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ عزیمت کا راستہ اختیار کرتے ہوئے اس کے سامنے حق واضح کر دیا جائے جیسا کہ رسول اللہؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ "ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کا اظہار سب سے بڑا جہاد ہے[۶]

---

[۱] الموطا کتاب النکاح باب ماجاء فی اضاعۃ اعمال ومسلم کتاب الاقضیہ۔

[۲] التمہید ۲۸۴/۲۱ [۳] ایضاً ۲۸۵/۲۱، ۳۹۱/۱ - ۴۸/۴ - ۵۸/۸ - ۱۶/۱۷م والاستذکار ۱۳۱/۱۴ - ۴۲/۱۴

[۴] التمہید ۲۸۱/۲۳، ۲۸۲

[۵] التمہید ۳۰۴/۲۴ - ۳۱۷

[۶] التمہید ۲۸۶/۲۱ ومسند احمد ۱۹/۳

۴۴۲

علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ جس طرح کفار کے سامنے حق کی اشاعت کا حکم ہے دراں حالیکہ ان سے جان کا خطرہ موجود ہے اسی طرح حاکم وقت یا امام کے سامنے بھی حق بات ظاہر کر دینی چاہیے[1] اس کی تائید بعض دیگر احادیث سے بھی ہوتی ہے۔

حضرت ابوسعیدؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا "کہ جب تمہیں کوئی حق بات معلوم ہو جائے تو اس کا اظہار کر دو اور کسی سے نہ ڈرو"[2]۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "قیامت کے دن سب سے افضل شہید حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کے بعد وہ شخص ہوگا جس نے ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کا اظہار کیا ہوگا اور جس کی پاداش میں اس کو شہید کر دیا گیا ہوگا"[3]

امام کی خیرخواہی کی ایک صورت یہ ہے کہ اس سے ملاقاتیں کی جائیں، دینی مسائل سمجھائے جائیں اور پند و نصیحت کی جائے۔ اس بارے میں علمائے اسلام کی گرچہ مختلف رائے ہے لیکن علامہ ابن عبدالبر نے بعض دلائل ایسے جمع کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین وقت سے علماء کا تعلق پیدا کرنا ایک دینی ضرورت ہے۔ ابوالمثنیٰ الجہنی فرماتے ہیں کہ میں مروان بن الحکم کے پاس موجود تھا۔ اسی دوران ابوسعید الخدریؓ وہاں حاضر ہوئے۔ مروان نے ان سے کہا کہ کیا آپ نے رسول اللہؐ سے یہ بات سنی ہے کہ آپؐ نے پانی (پینے کی چیز) میں پھونکنے (یا سانس لینے) سے منع فرمایا ہے انھوں نے جواب دیا کہ ہاں میں نے یہ بات سنی ہے[4] ایک دوسری روایت میں ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک روز نماز موخر کر دی تو ان کے پاس عروہ بن الزبیرؒ حاضر ہوئے اور ان کو نصیحت فرمائی[5] ایک اور روایت میں حضرت عائشہؓ

---

[1] التمہید ۲۳/۲۸۲
[2] التمہید ۱۳/۵۴ ومسند احمد ۳/۴۷
[3] المستدرک للحاکم ۳/۱۹۵
[4] المؤطا کتاب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
[5] المؤطا کتاب وقوت الصلاۃ

سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا "جس شخص کی رسائی سلطانِ وقت تک ہو اور وہ کسی ضرورت مند کی ضرورت کو اس کے سامنے اس لیے بیان کرے کہ وہ ضرورت مند خود اس تک رسائی پر قادر نہ تھا تو اللہ تعالیٰ اس کو پل صراط پر جہاں لوگوں کے قدم پھسل جائیں گے ثابت قدمی عطا فرمائے گا۔ اس مفہوم کی روایت اور دوسرے طرق سے بھی وارد ہے[1]

بعض روایتوں میں سلاطین کی مجلس اور ان کی صحبت سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ آدمی ذاتی یا وقتی مفاد کی خاطر بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملانے لگتا ہے اور اس طرح وہ خود فتنہ میں پڑ سکتا ہے لہٰذا ایسی صورت میں صحبت سلطان سے احتراز اولیٰ ہے۔ رسول اللہؐ کا ارشاد ہے۔

سیکون بعدی امراء فمن دخل علیہم وصدقہم بکذبہم واعانہم علی ظلمہم فلیس منی ولست منہ ولا یرد علی الحوض ومن لم یصدقہم بکذبہم ولم یعنہم فہو منی وأنا منہ وسیرد علی الحوض[2]

عنقریب میرے بعد نظام سلطنت چلانے والے بادشاہ ہوں گے پس جو ان کے پاس جائے اور ان کے جھوٹ کی تصدیق کرے اور ان کے ظلم میں ان کی معاونت کرے وہ مجھ سے نہیں اور میں اس سے نہیں۔ قیامت میں وہ حوض کوثر سے مستفید نہ ہو سکے گا۔ البتہ جو شخص بادشاہوں کے جھوٹ کی تصدیق نہ کرے اور نہ ان کے ظلم میں ان کی معاونت کرے تو وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں وہ حوضِ کوثر کا مستحق ہوگا۔

چنانچہ بعض علماء اسلام مثلاً فضیل بن عیاضؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور ایوب سختیانی کی اس بارے میں سخت رائے ہے۔ ان کے نزدیک سلاطین کی صحبت سے ہر حال میں پرہیز

---

[1] التمہید ۱۳/۵۳ والطبرانی فی الصغیر ۱/۱۶۱

[2] التمہید ۲۱/۲۸۶ والطبرانی فی الکبیر ۱۹/۱۳۴/۴۴۴

کرنا چاہیے [1]

۴۔ عدل کا قیام

امامت عظمیٰ کی چوتھی بنیاد عدل کا قیام ہے۔ عدل کے معنی کسی چیز کو دو حصوں میں برابر تقسیم کرنے کے ہیں۔ اصطلاح میں عدل کسی معاملہ میں افراط و تفریط کے بیچ توازن قائم کرنے کو کہا جاتا ہے اور قانون کی زبان میں عدل کے معنی کسی مقدمہ کا حق کے مطابق فیصلہ کرنے کے ہیں۔

کسی بھی اجتماعیت کو باقی رکھنے کے لیے عدل ایک بنیادی پتھر ہے اس کے بغیر کوئی نظام وجود میں آسکتا ہے اور نہ دیر تک قائم رہ سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام نے امامت عظمیٰ کے قیام کے لیے اس کو اساسی اہمیت دی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ (النحل: ۹۰) — بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

حضرت علی بن ابی طالبؓ ایک خطبے میں ارشاد فرماتے ہیں اے حاکمو! تمہارے اوپر رعایا کے بہت سے حقوق ہیں۔ ان میں اولین حق عدل کے مطابق فیصلہ کرنا اور مساوات قائم کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو امام عادل کا مبنی بر انصاف فیصلہ سب سے زیادہ محبوب ہے [2]

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو ان کے ایک گورنر نے ایک بار خط لکھا کہ ہمارا شہر مرمت کا محتاج ہے تو انھوں نے اس کا جواب دیا کہ "اپنے شہر کی عدل کے ذریعہ حفاظت کرو اور اس کے راستوں کو ظلم سے بچاؤ"۔ ایک بار عمر بن عبدالعزیزؒ نے کعب القرظی سے سوال کیا کہ عدل کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا "یہ ایک عظیم شی ہے۔ عدل یہ ہے کہ تم چھوٹوں کے حق میں باپ اور بڑوں کے حق میں بیٹا اور

---

[1] ایضاً دیکھئے جلد ۲۱/۲۸۶ جلد ۱/۲۸۶ وجامع بیان العلم وفضلہ ۱/ ۶۷-۱۶۳

[2] الاستذکار ۲۷/۱۰۷

ہم سروں کے حق میں بھائی بن جاؤ اور لوگوں کی ان کی غلطیوں کے بقدر گرفت کرو۔[۱]

ایک حدیث میں وارد ہے کہ قیامت کے دن سات قسم کے لوگ اللہ کے سائے میں ہوں گے جب کہ اس دن اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔[۲] ان میں سے ایک "امام عادل" بھی ہے ایک اور حدیث میں وارد ہے کہ امام عادل کی دعا رد نہیں کی جاتی ہے۔[۳]

عدل امامت کبریٰ کے قیام کی ایک اہم بنیاد ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ صرف سلطان وقت ہی سے یہ چیز مطلوب ہے بلکہ ہر اس شخص پر اس کا قیام لازم ہے جو کسی دو آدمی کے درمیان ہی کیوں نہ حکم بنایا گیا ہو جیسا کہ ارشاد نبوی ہے کہ "تم میں کا ہر ایک راعی ہے اور ہر ایک اپنی رعیت کے بارے میں جوابدہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن وہ انصاف کرنے والے رحمان کے نور کے منبروں پر ہوں گے جو اپنے اہل وعیال اور اپنے غلاموں اور ماتحتوں کے درمیان انصاف کرتے ہیں۔[۴]

عدل کے مقابلے میں ظلم ہے اسلام نے جس طرح عدل کی تعریف کی ہے اور اس کے قیام کی بہت تاکید کی ہے اسی طرح اس نے ظلم کی مذمت کی ہے، اس کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے اور اس پر جہنم کی وعید سنائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَاَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا (الجن : ۱۵)

اور جو حق سے منحرف ہیں وہ جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں۔

یہاں "قاسطون" سے مراد "جائرون" یعنی ظلم وستم کرنے والے ہیں "جائر" کے معنی حق سے باطل کی طرف پھر جانے کے ہیں علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ علمائے اسلام

---

[۱] سیر اعلام النبلاء ۵/ ۶۵ بہجۃ المجالس لابن عبدالبر ۱/ ۳۴۴ - ۳۴۵

[۲] الموطا کتاب الشعر بخاری کتاب الحدود باب فضل من ترک الفواحش

[۳] التمہید ۲/ ۲۸۲ ومسند احمد ۲/ ۴۴۴

[۴] التمہید ۲/ ۲۸۴ ومسلم کتاب الامارۃ

کا اس پر اتفاق ہے کہ فیصلہ کرنے میں ناانصافی کرنا کبیرہ گناہ ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی سخت وعید آئی ہے[۱]

۵۔ مشاورت

امامت عظمیٰ کے قیام کی پانچویں بنیاد مشاورت ہے۔ مشورہ یا مشاورت کے معنی ایک دوسرے کی رائے جاننے کے ہیں ابن عطیہ اندلسی فرماتے ہیں کہ مشورہ شریعت کی ایک اہم بنیاد ہے[۲] علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ قاضی حاکم یا امام کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ علماء واصحاب الرائے سے مشورہ کے بغیر کوئی فیصلہ نافذ کردے[۳] چنانچہ خلیفہ ثانی حضرت عمر بن الخطابؓ کا معمول تھا کہ ہر پیش آمدہ مسئلہ پر آپ لوگوں سے مشورہ طلب کرتے اور اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ صادر فرماتے تھے۔ مشہور واقعہ ہے کہ آپ شام کے سفر میں تھے کہ خبر آئی کہ وہاں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ آپ نے فوراً حاضرین سے مشورہ کیا کہ اب کیا کیا جائے، سفر جاری رہے یا واپسی اختیار کی جائے؟ لوگوں نے مشورۃً اس حدیث کا حوالہ دیا جس میں کہا گیا ہے کہ طاعون زدہ علاقہ سے بھاگنا بھی درست نہیں ہے اور اس جگہ جانا بھی درست نہیں ہے لہٰذا آپ نے وہاں نہ جانے کا فیصلہ فرمایا[۴]

ایک حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت معاذ بن جبلؓ کو یمن کی طرف قاضی بنا کر بھیجا تو ان کو تلقین فرمائی کہ جب تک کسی معاملہ کی تہہ تک نہ پہونچ جاؤ کوئی فیصلہ صادر نہ کرنا اور اگر کوئی فیصلہ تمہارے درمیان ناقابل حل معلوم ہو تو اس کے بارے میں لوگوں سے مشورہ کرنا کیونکہ مشورہ سے بہت سی مشکل باتیں حل ہو جاتی ہیں اور اگر اس کے باوجود اس کی گرہ کشائی نہ ہو تو

---

[۱] الاستذکار ۲۷/۲۳۷

[۲] المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز ۳/۲۸۰

[۳] التمہید ۸/۳۶۹

[۴] الموطا کتاب الجامع و بخاری کتاب الطب باب ما یذکر فی الطاعون

اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو یہاں تک کہ کوئی بات واضح ہو جائے یا پھر مجھے اس سے آگاہ کرو اور تم ایسے فیصلے پر اصرار نہ کرو جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں موجود نہ ہو۔[۱]

مشورہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایمان کا ایک امتیازی وصف قرار دیا ہے اور مشورہ کرنے والوں کی تعریف فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (الشوریٰ: ۳۸)	اور وہ لوگ جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں اور جو کچھ بھی ہم نے ان کو دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جنگوں اور اہم مواقع پر آپ لوگوں سے ضرور مشورہ کرتے تھے۔[۲]

علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ مشورہ ان مسائل میں کیا جائے گا جن کے بارے میں قرآن وسنت میں کوئی حکم موجود نہیں ہے لیکن جن کے بارے میں قرآن وسنت میں پہلے سے نص موجود ہے۔ ان میں مشورہ کی ضرورت نہیں ہے۔[۳]

مشورہ کا مطلب محض لوگوں کی رائے جاننا نہیں ہے بلکہ پیش آمدہ مسئلہ میں شرعی تعلیمات سے ہم آہنگ فیصلہ مطلوب ہے چنانچہ مشورہ ایسے لوگوں سے کیا جائے گا جو فی الجملہ دین کا علم رکھتے ہوں، جن کے اندر اجتہاد کی صلاحیت موجود ہو اور وہ خود دینی احکام پر عمل کرتے ہوں اور صفت عدل سے متصف ہوں۔

مشورہ کرنا ضروری ہے لیکن ہر مشورہ کے مطابق عمل کرنا ضروری نہیں ہے کیونکہ بعض اوقات ایک مسئلہ میں لوگوں کی رائے مختلف ہوتی ہے اور امام کے لیے ممکن

---

[۱] التمہید ۸/۳۷۰　　[۲] الاستذکار ۱۴/۴۴

[۳] التمہید ۸/۳۶۸

نہیں ہے کہ بیک وقت وہ مختلف رایوں پر عمل کر سکے۔ لہٰذا علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ اگر مشورہ دینے والے نے قرآن وسنت سے کوئی واضح اور مضبوط دلیل فراہم نہ کی تو مشورہ طلب کرنے والے کو اختیار ہوگا کہ چاہے تو وہ اس پر عمل کرے چاہے نہ کرے۔[1]

امام اور اس کی مطلوبہ شرائط

امام، سلطان، خلیفہ یا امیر المومنین ریاست کا اعلیٰ ذمہ دار ہوتا ہے۔ حدیث میں اسی لیے اس کو "راعی" (چرواہا) کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ علامہ ابن حجر العسقلانی فرماتے ہیں کہ "راعی وہ ہے جو محافظ، امانت دار عادل اور دینی و دنیاوی مصالح کے مطابق رعیت کی نگہبانی کرے"۔[2] چنانچہ امام ہی کو ریاست کا آخری جوابدہ سمجھا گیا ہے۔

امامت جب اتنی عظیم ذمہ داری ہے تو لازم ہے کہ اس کے لیے بعض اہم شرائط ہوں تاکہ ان کی روشنی میں امام کا انتخاب ہو سکے۔ علماء اسلام نے اس کی گیارہ شرائط بیان کی ہیں۔[3]

۱۔ وہ قریش کی نسل سے ہو۔

۲۔ اس کے اندر اجتہاد کی صلاحیت موجود ہو۔

۳۔ وہ ریاست اور دنیا کے حالات سے واقف ہو اور کسی معاملہ میں خود اپنی رائے قائم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

۴۔ حدود و تعزیرات کے نفاذ میں جس پر نرمی کا جذبہ غالب نہ آئے۔

۵۔ آزاد ہو، یعنی شرعی اصطلاح کے مطابق وہ غلام نہ ہو۔

۶۔ مسلمان ہو۔ کیونکہ کسی اسلامی ریاست کا کوئی غیر مسلم امام نہیں ہو سکتا۔

۷۔ مرد ہو عورت اسلامی ریاست کی سربراہ نہیں ہو سکتی ہے۔ ہاں اس سے کمتر دیگر مناصب اس کو دیے جا سکتے ہیں۔

۸۔ جسمانی طور پر معذور نہ ہو یعنی گونگا، بہرا اور اندھا نہ ہو کہ احکامات جاری کرنے

---

[1] ایضاً نیز دیکھئے ص ۳۶

[2] فتح الباری ۱۳/۱۱۲

[3] الجامع الاحکام القرآن للقرطبی ۱/۲۷۰ شرح المقاصد للتفتازانی ۵/۲۳۳ والاحکام السلطانیہ للماوردی ص ۳۱، ۴۴۹

میں اسے دوسرے کی مدد کی ضرورت پڑے۔

۹۔ بالغ ہو کیونکہ شرعی نقطۂ نظر سے کوئی بچہ یا نابالغ اپنے اقدامات کا ذمہ دار نہیں ہوتا واضح رہے کہ یہاں صرف بلوغت کی قید ہے موجودہ مروجہ طریقہ کے مطابق چالیس سال کی قید نہیں ہے۔

۱۰۔ عاقل ہو کسی پاگل اور مجنوں کو ریاست کا ذمہ دار اعلیٰ نہیں بنایا جاسکتا ہے۔

۱۱۔ عادل ہو۔ عادل کا ایک مفہوم "انصاف قائم کرنے والا ہوتا ہے۔ لیکن یہاں عدالت کا اس سے وسیع تر مفہوم ہے۔ آگے اس کی تفصیل آرہی ہے۔

ان میں سے بعض شرائط وہ ہیں جن پر امت کا اتفاق ہے جیسے مسلمان، عادل، مرد، عاقل اور عالم ہونا البتہ بعض شرائط جیسے صاحب رائے اور سلیم الاعضاء ہونے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ جہاں تک عدالت کا سوال ہے علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ فسق وفجور اور فساد پروری میں مشہور نہ ہو۔ مزید فرماتے ہیں کہ عدالت کے مفہوم میں بدخلقی بھی شامل ہے جیسا کہ رسول اللہ نے غزوۂ حنین کے موقع پر مال غنیمت تقسیم کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کی قسم اگر مجھے اللہ تعالیٰ تہامہ کے ببول کے درختوں کے برابر اونٹ دیتا تو انھیں بھی تمہارے درمیان تقسیم کر دیتا اور تم مجھے کبھی بخیل، بزدل اور جھوٹا نہ پاؤ گے[1] علماء نے اس سے استدلال کیا ہے کہ امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ رذائل اخلاق سے پاک ہو[2]

امام کے لیے ایک شرط صاحب فضل ہونا بھی بیان کی جاتی ہے۔ فضل کے معنی "زیادہ ہونے" کے ہیں اس سے مراد حسن خلق میں امام کا دوسرے لوگوں سے بڑھ کر ہونا ہے۔ علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ امام کی یہ بھی ایک قابل لحاظ شرط ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عوام الناس کے مقابلے میں اخلاق وکردار میں ممتاز ہو[3]

---

[1] المؤطا کتاب الجہاد

[2] التمہید ۲۰/۳۹ والاستذکار ۱۴/۱۸۲

[3] التمہید ۲۱/۲۷۹

امام کی ایک شرط علم ہے۔ علم کے معنی کسی شی کی حقیقت جاننے کے ہیں۔ اصطلاح میں اس سے مراد دینی علم ہے امام کا کام عوام الناس کی رہ نمائی ہے۔ اگر وہ خود علم سے بے بہرہ ہو تو لوگوں کی رہ نمائی کیونکر کر سکتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ وہ عالم ہو تاکہ شرعی احکام کے مطابق وہ ہر معاملے کا فیصلہ کر سکے[1]

امام کے لیے ایک شرط قوت بھی بیان کی گئی ہے جیسا کہ قرآن میں وارد ہے "وَقَالُوا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً" (حم السجدہ: ۱۵) (کہنے لگے کون ہے ہم سے زیادہ زور آور) علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ قوی اور امین ہو جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ	بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی
الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ (القصص: ۲۶)[2]	ہو سکتا ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو۔

قوت کے مقابلے میں بزدلی اور پست ہمتی ہے علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ امام کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ بزدل ہو[3]

امام کا طریقۂ انتخاب

کسی ریاست کا سربراہ ہونا ایک اعزاز بھی ہے اور ایک عظیم ذمہ داری بھی ہے ریاست میں متعدد لوگ ہو سکتے ہیں جو اس ذمہ داری کو نبھا سکیں یا اس اعزاز کو پائیں پھر اس کا انتخاب کیسے ہو؟ اس کی چار ممکنہ صورتیں ہیں۔

۱۔ پہلی صورت یہ ہے کہ قرآن و سنت میں کسی شخص کے بارے میں نص موجود ہو کہ اس کو یہ عہدہ دیا جائے اس صورت میں اس کو یہ عہدہ دیا جائے گا لیکن قرآن و حدیث میں اس قسم کی کوئی نص وارد نہیں ہے لہٰذا یہ طریقہ ناقابل عمل ہے[4]

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص بزور طاقت اس منصب کو حاصل کر لے۔ اس کے بارے میں شریعت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ چونکہ اس صورت میں عوام الناس کو

---

[1] فتح الباری ۱۴۱/۱ والاستذکار ۴۰/۱۴-۴۱

[2] السیاسۃ الشرعیۃ لابن تیمیہ ص۱۹

[3] التمہید ۳۹/۲۰

[4] التمہید ۱۲۵/۲۲-۱۳۳، ۴۵۱

انتخاب کرنے یا نہ کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ایک اضطراری صورت ہے۔ اگر کوئی شخص بزور طاقت اس کو حاصل کر ہی لے تو بتقاضائے مصلحت اس کو تسلیم کر لیا جائے گا اور سمع وطاعت کی جائے گی لیکن اسے انتخاب نہیں قبضہ کہا جا سکتا ہے۔

۳۔ تیسری صورت یہ کہ ریاست کے ارباب حل وعقد کسی ایک فرد کو اس منصب کے لیے منتخب کریں۔

۴۔ چوتھی صورت یہ کہ ریاست کا موجودہ امام اپنا جانشین مقرر کرے۔

اسلامی تعلیمات مؤخر الذکر دو صورتوں کی تائید کرتی ہیں۔ علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ ان دو طریقوں سے جو شخص امام منتخب کر لیا جائے اس کی سمع وطاعت ضروری ہے چاہے بذات خود وہ فاسق وظالم ہو۔ معتزلہ اور خوارج کے نزدیک ایسے امام کے خلاف خروج واجب ہے علمائے سلف کا مسلک یہ ہے کہ بہتر صورت یہی ہے کہ منتخب ہونے والے امام کے اندر جملہ شرائط موجود ہوں لیکن اگر ان میں سے بعض شرائط مفقود ہوں تو اس کے خلاف خروج درست نہیں ہے صبر کے ساتھ سمع وطاعت کی جائے گی تاکہ فتنہ وفساد کا سلسلہ شروع نہ ہو جائے[1]

امام کا انتخاب ہو جانے کے بعد اس کے ہاتھ پر بیعت کی جائے گی ایک سوال یہ ہے کہ کیا ریاست کے ہر فرد کا بیعت کرنا ضروری ہوگا یا کچھ لوگوں کی بیعت کافی سمجھی جائے گی۔

اس بارے میں علمائے اسلام کی مختلف آرا ہیں۔ بعض کے نزدیک ہر ایک کا بیعت کرنا ضروری ہے بعض کے نزدیک ارباب حل وعقد کی بیعت کافی ہوگی۔ بعض کے نزدیک جو لوگ آسانی سے امام کے پاس حاضر ہو کر بیعت کر سکیں ان کی بیعت کافی سمجھی جائے گی۔ بعض کے نزدیک دو، بعض کے نزدیک ایک شخص بھی بیعت کر لے تو کافی ہوگی۔ راجح قول یہ ہے کہ ارباب حل وعقد کی اکثریت کی بیعت کافی ہوگی یہی مسلک امام ابن تیمیہ کا بھی ہے، علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ ارباب

---

[1] الاستذکار ۱۴/۴۰۰-۴۰۱ والتمہید ۲۳/۲۷۸-۲۷۹
۴۵۲

حل وعقد کی اکثریت میں بھی جو لوگ بسہولت بیعت کے لیے حاضر ہو سکیں انہی کی بیعت کافی سمجھی جائے گی مثال کے طور پر موجودہ امام کا انتقال ہو جائے اور فوری طور پر جو لوگ حاضر ہوں اور وہ کسی کو امام منتخب کرلیں تو سب لوگوں پر سمع وطاعت لازم ہو گی۔[1]

امام کے حقوق

اسلامی ریاست امام کو کچھ حقوق دیتی ہے جن کی ادائیگی عامۃ الناس پر لازم ہوگی علماء نے اس کے درج ذیل حقوق کا ذکر کیا ہے[2]

۱۔ معروف میں اس کی سمع وطاعت کی جائے گی۔

۲۔ علانیہ اور پوشیدہ ہر حال میں اس کی خیر خواہی کی جائے گی۔

۳۔ ظاہری اور باطنی طور پر اس کی مدد کی جائے گی۔

۴۔ اس کا ادب واحترام کیا جائے گا یعنی اس کو گالی گلوج نہیں دی جائے گی۔ اور اس کی توہین نہیں کی جائے گی۔

۵۔ اگر اس کے اندر کوئی برائی موجود ہو تو اس کی اصلاح کی جائے گی۔

۶۔ دشمن سے مقابلہ کرنے میں اس کی مدد کی جائے گی۔

۷۔ اس کے ماتحتوں کے سیرت وکردار سے اس کو آگاہ کیا جائے گا۔

۸۔ ہر اس کام میں اس کی معاونت کی جائے گی جو امت کی فلاح وترقی کے لیے ہو۔

۹۔ اس کے مخالفین کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

علامہ ابن عبدالبر نے ان حقوق کو سمع وطاعت، نصح وخیر خواہی اور ادب واحترام کے عنوان سے بیان کیا ہے[3]

---

[1] الاحکام السلطانیہ ص۳۳ وغیاث الامم للجوینی ص۶۷ ومنہاج السنۃ النبویۃ لابن تیمیہ ۵۳۰/۱ التمہید ۲۷۶/۲۱۔

[2] تحریر الاحکام فی تدبیر اہل الاسلام لابن جماعۃ ص۶۱

[3] التمہید ۲۸۵/۲۱ - ۲۲۹/۱۷ والاستذکار ۲۵۳-۷۰/۱۴

امام کے فرائض

امام پر کچھ فرائض بھی عائد ہوتے ہیں۔ علامہ ماوردی نے اس کے دس فرائض بیان کیے ہیں [1]

۱۔ دین کی حفاظت اپنے تمام اصول وضوابط کے ساتھ۔
۲۔ دو متنازع اشخاص کے درمیان جھگڑے کا فیصلہ کرنا۔
۳۔ حق کی حمایت اور باطل کی مخالفت۔
۴۔ حدود و تعزیرات کا نفاذ۔
۵۔ سرحدوں کی حفاظت۔
۶۔ دشمنان اسلام کے خلاف جہاد
۷۔ مال فیٔ اور زکوٰۃ وصدقات وخیرات کو شرعی اصولوں کے مطابق جمع کرنا۔
۸۔ اسراف اور تنگی سے بچتے ہوئے کارکنوں کی تنخواہوں کی تعیین۔
۹۔ کارکنوں کی کارکردگی کا جائزہ اور ان سے جواب طلبی۔
۱۰۔ ریاست کے مسائل میں ذاتی دلچسپی اور ان کا حل تلاش کرنا۔

علامہ ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں کہ امام کو جتنے حقوق حاصل ہیں انہی کے مطابق اس پر فرائض بھی عائد ہوتے ہیں [2] ان فرائض کو انھوں نے احکام الٰہی کا نفاذ، عدل کا قیام، مشاورت، رعایا کے حقوق کی نگہبانی، امام کے ساتھ نصح وخیر خواہی اور نرمی و حسن معاملگی کے عنوان کے تحت بیان کیا ہے۔ جن کی تفصیل پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے ان کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں ہے البتہ رعایا کے حق میں نصح وخیر خواہی کے ذیل میں علامہ موصوف فرماتے ہیں کہ "امام پر رعایا کی خبر گیری اس طور سے لازم ہوگی کہ وہ ان کے قریب جا کر ان کے مسائل کو سمجھے جیسا کہ حضرت عمر بن الخطابؓ کا معمول تھا۔ آپ مدینہ سے شام تک کا طویل سفر محض اسی غرض کے تحت کرتے تھے کہ لوگوں کے احوال سے

---

[1] الاحکام السلطانیہ للماوردی ص ۵۱-۵۲ وغیاث الامم ص ۱۸۰

[2] التمہید ۲۱/۲۸۸

واقف ہوں وہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر ایک بکری بھی میری خبر گیری نہ کرنے کی وجہ سے مرجائے تو قیامت کے دن مجھ سے باز پرس ہوگی[۱]

رعایا کے ساتھ حسن سلوک اور نرمی کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی کہ "اے اللہ تعالیٰ میری امت میں سے جس شخص کو والی (امام یا حاکم) بنایا جائے اور وہ لوگوں پر سختیاں کرے اس پر تو بھی سختی کر اور جو لوگوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرے اس کے ساتھ تو بھی نرمی کا برتاؤ کر"[۲] ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ کو نصیحت کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اپنے اخلاق کو لوگوں کے لیے بہتر کرو"[۳]

علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ رعایا کی خیر خواہی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے ان کو دین و دنیاوی تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کیا جائے۔ کیونکہ اسلام نے علم کو بہت اہمیت دی ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "علم حاصل کرو کیونکہ اس کا حصول خشیت پیدا کرتا ہے اور وہ عبادت ہے اس کا مذاکرہ اللہ کی تسبیح ہے، اس کے بارے میں تحقیق و جستجو جہاد ہے اور اس کا دوسروں کو اور اپنے اہل و عیال کو سکھانا صدقہ ہے"[۴] حضرت عمر بن عبدالعزیز اپنے گورنروں کو تاکید کرتے تھے کہ لوگوں میں علم عام کیا جائے[۵]

ریاست کے دفاع کے تعلق سے علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ اگر باہر سے ریاست پر حملہ ہو تو امام پر واجب ہوگا کہ وہ بذات خود اس کے دفاع کے لیے

---

[۱] الاستذکار ۲۷/۲۸۷ التمہید ۸/۳۶۵

[۲] صحیح مسلم کتاب الامارہ نمبر ۱۹ و مسند احمد ۶/۶۲

[۳] المؤطا کتاب حسن الخلق

[۴] جامع بیان العلم وفضلہ لابن عبدالبر ۱/۵۴-۵۵

[۵] التمہید ۱/۸۰-۸۱

میدان جنگ میں حاضر ہو اور لڑائی میں حصہ لے۔ نیز ریاست کے ان افراد کو اس کے لیے تیار کرے جو اس کے اہل ہوں[1] ریاست کے اندرونی فتنہ وفساد، فکری انحرافات اور ذاتی مفادات کے لیے جوڑ توڑ کی کوششوں کو دبانا بھی امام کی ذمہ داری ہے۔ علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ جو شخص جماعت میں پھوٹ ڈالے، مسلمانوں کے خلاف ہتھیار کا استعمال کرے، دہشت پھیلائے اور راستوں کو پرخطر بنائے تو اس کو قتل کرنا واجب ہوگا۔ اور یہ ریاست کی ذمہ داری ہوگی کیونکہ اس کے بغیر اس کی حفاظت ہو ہی نہیں سکتی۔ الا یہ کہ وہ شخص توبہ کرے اور اپنی حرکتوں سے باز آجائے[2] جہاں تک نماز روزہ اور دیگر دینی فرائض کے ترک کرنے والے کے بارے میں سوال ہے تو حضرت ابوبکرؓ کے فیصلہ کے مطابق ان سے بھی قتال واجب ہے یہی امام شافعی کا مسلک ہے اور اسی کو علامہ ابن عبدالبر نے راجح قرار دیا ہے[3]

رعایا اور ان کی حیثیت

شریعت میں رعیت ہر اس فرد کو کہا جاتا ہے جو اسلامی ریاست کا شہری ہو[4] اس کی دو قسمیں ہیں ایک مسلم رعایا اور دوسری غیر مسلم رعایا۔ شریعت میں ان دونوں کے حقوق اور فرائض متعین ہیں۔

مسلم رعایا کے حقوق

اسلامی ریاست میں مسلم رعایا کے کچھ حقوق انفرادی نوعیت کے ہیں اور کچھ اجتماعی نوعیت کے۔ انفرادی حقوق میں جان، مال، عزت وآبرو، دین اور عقل کی حفاظت شامل ہے۔ اجتماعی حقوق میں مساوات، حریت، کفالت باہمی اور دفاع

---

[1] التمہید ۲۲۷/۲۳ والاستذکار ۱۲۲/۶ ۲۹۴/۱

[2] التمہید ۳۳۹/۲۳ [3] ایضاً ۲۳۲/۴

[4] معجم لغۃ الفقہاء للدکتور محمد رواس قلعہ جی والدکتور حامد قنیبی ص ۲۲۶

خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی اونٹ کسی انسان پر حملہ کردے اور وہ اپنی مدافعت میں اونٹ کو جان سے مار دے تو اس پر تاوان نہیں ہوگا۔ اسی طرح کوئی آدمی کسی پر حملہ کردے اور وہ اپنے دفاع میں دوسرے کی جان لے لے تو اس پر بھی قصاص لازم نہیں آئے گی ایک حدیث میں ارشاد ہے۔

عن سعید بن زیدان	سعید بن زید سے مروی ہے کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ	رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جو شخص اپنے
وسلم قال من قتل دون	دین کی مدافعت میں قتل کیا گیا وہ
دینہ فھو شھید ومن	شہید ہے اور جو شخص اپنی جان کی
قتل دون دمہ فھو شھید	مدافعت میں قتل کیا گیا وہ شہید
ومن قتل دون مالہ فھو	ہے جو شخص اپنے مال کی مدافعت
شھید ومن قتل دون اھلہ	میں قتل کیا گیا وہ شہید ہے جو شخص
فھو شھید [1]	اپنے اہل وعیال کی مدافعت میں
	قتل کیا گیا وہ شہید ہے۔

ایک اور حدیث میں ارشاد نبوی ہے کہ "تم میں سے کوئی شخص ہرگز بھی کسی دوسرے کی اونٹنی اس کے مالک کی اجازت کے بغیر نہ دوہے" ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ تمہارے لیے حلال نہیں ہے کہ تم کسی مسلمان کا مال ناجائز طریقے سے کھالو[2] مزید ارشاد فرماتے ہیں کہ بے شک جان، مال اور عزت وآبرو پر دست درازی تمہارے اوپر حرام ہے[3]

متعلقہ حقوق اور اسلامی ریاست کی ذمہ داریاں

علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ امام پر لازم ہوگا کہ وہ لوگوں کی جان کی

---

[1] سنن ابن ماجہ کتاب الدیات باب نمبر ۲۲ وسنن ابی داؤد کتاب الادب باب فی قتال اللصوص
[2] المؤطا کتاب الاستیذان [3] صحیح مسلم کتاب القسامۃ۔

حفاظت کا سامان کرے۔ اس کا تقاضا ہوگا کہ متعدی اور خطرناک امراض ریاست میں پنپنے نہ پائیں اور اگر وہ کہیں پیدا ہو گئے ہوں تو ان کا جلد سے جلد علاج تلاش کیا جائے تاکہ دوسرے لوگوں کو وہ لاحق نہ ہوں۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے ایک جذام زدہ خاتون کو کعبہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھا تو اسے ہدایت فرمائی کہ تمہارا گھر میں بیٹھے رہنا بہتر ہے کیونکہ اس سے دوسروں کو تکلیف پہونچنے کا خطرہ ہے اور ایک مومن یا ایک پڑوسی کو اپنی ایذا سے بچانے کی شریعت نے واضح تعلیم دی ہے چنانچہ مسجد میں پیاز لہسن یا اسی قسم کی دوسری چیزیں جن کے کھانے سے منہ میں بدبو کی کیفیت پیدا ہو، کھا کر آنے کی ممانعت کی گئی ہے اس کی حکمت یہی ہے کہ اس سے دوسروں کو تکلیف پہونچتی ہے[1]

عزت و آبرو کی حفاظت سے مراد انسانی شرافت کی حفاظت ہے۔ کسی کی عزت و آبرو پر دست درازی سے بھی اسے ذہنی و نفسیاتی ٹھیس پہونچتی ہے اور اس کو برا بھلا کہنے اور گالی گلوج دینے سے بھی تکلیف پہونچتی ہے۔ انسانی شرافت کی حفاظت میں یہ دونوں باتیں شامل ہیں[2]

ہر فرد کی معاشی کفالت اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہوگی کوئی فقیر مرجائے اور وہ مقروض ہو تو اسلامی ریاست اس کا قرض ادا کرے گی[3]

ان تفصیلات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی ریاست میں فرد کے حقوق کا بہت لحاظ کیا گیا ہے اور اس کو ضائع ہونے سے بچانے کی ہر ممکن تدبیر کی گئی ہے۔

غیر مسلم رعایا کے حقوق[4]

اسلامی ریاست میں رعایا کی دوسری قسم غیر مسلموں کی ہے ان کی دو حیثیتیں ہیں ایک

---

[1] المؤطا کتاب الحج والاستذکار ۱۳/۳۵۵-۳۵۶

[2] النہایۃ فی غریب الحدیث لابن الاثیر ۲/۲۰۸

[3] بخاری کتاب الاستقراض باب الصلوٰۃ علی من ترک دینًا۔ والاستذکار ۱۴/۲۲۸-۲۲۹

[4] اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ کیجئے مولانا سید جلال الدین عمری کی اہم کتاب "غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق"۔ ۵۸

ذمی دوسرا معاہد، ذمی ان غیر مسلم رعایا کو کہا جاتا ہے جن کے علاقے جنگ کے بعد فتح ہوئے ہوں اور اسلامی ریاست نے ان کے باشندوں کی جان مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہو اور انھیں مناسب مذہبی آزادی عطا کی ہو۔ ان سے جزیہ یا ایک متعین ٹیکس لیا جاتا ہے۔ معاہد وہ غیر مسلم ہیں جن کے علاقے جنگ کے ذریعہ فتح نہ ہوئے ہوں بلکہ وہ بعض شرائط کے ساتھ اسلامی ریاست میں شامل ہوئے ہوں یہ معاہدہ وقتی بھی ہو سکتا ہے اور مستقل بھی، انفرادی بھی ہو سکتا ہے اور اجتماعی بھی۔ شریعت میں ان سب کی گنجائش موجود ہے اور ان کے حقوق متعین ہیں۔ ان غیر مسلم رعایا کو جو حقوق حاصل ہیں وہ بنیادی انسانی حقوق کہلاتے ہیں۔ مثلاً جان، مال، عزت و آبرو اور مذہبی آزادی وغیرہ، علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ عہد و پیمان کی اسلامی شریعت میں کافی اہمیت ہے چنانچہ ایک کافر جس سے اعلان جنگ کا حکم ہے معاہدہ کے ذریعہ اس کا خون حرام ہو جاتا ہے[1] امت کا اس پر اجماع ہے کہ کسی غیر مسلم کو امان دے کر دھوکے سے اس کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ حضرت عمر بن الخطابؓ کا حکم تھا کہ اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم معاہد کو قتل کر دے تو اس پر قصاص لازم ہوگا۔[2]

غیر مسلم رعایا کی جان کی طرح ان کے مال کی حفاظت بھی اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کسی کو ان کے مال پر قبضہ کرنے اور ان سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی اجازت نہ ہوگی اور انھیں اپنے مال و جائداد پر حسب منشا تصرف کا حق حاصل ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

الا لا یحل اموال المعاهدین	خبردار! معاہدین کے اموال بغیر کسی
الا بحقها[3]	حق کے حلال نہیں ہیں۔

اسلامی ریاست میں غیر مسلم رعایا کے اور بھی بہت سے حقوق ہیں علامہ ابن عبدالبر

= ناشر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

[1] الاستذکار ۱۴/۸۴ - ۲۵/۱۲۶

[2] التمہید ۲۴/۲۳۴

[3] سنن ابی داؤد کتاب الاطعمہ باب نہی عن اکل السباع، الاستذکار ۹/۳۲۲

فرماتے کہ ان کے حقوق کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ ان کے ساتھ حسن سلوک اور نرمی کا برتاؤ کریں اور ان کو کسی قسم کی ایذا رسانی سے گریز کریں۔ حدیث میں ہے کہ ان کی مناسب طریقے سے عزت و تکریم کی جائے گی، ان کو سلام بھی کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر وہ بیمار پڑیں تو ان کی عیادت بھی کی جائے گی۔ غرض کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم رعایا کو باعزت زندگی گزارنے کا پورا پورا حق ہوگا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

اذا اتاکم کریم قوم فاکرموہ [1]	جب تمہارے پاس کسی قوم کا کوئی معزز فرد آئے تو اس کے ساتھ عزت سے پیش آؤ۔

---

[1] السنن الکبری للبیہقی ۸/۱۶۸ والتمہید ۱۷/۹۱-۹۲-۱۸۲

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کی اہم پیش کش

قرآن اہلِ کتاب اور مسلمان

از

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

قرآن کریم میں اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے حالات پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان پر اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات، ان کی بداعتقادیوں اور بداعمالیوں کی تفصیلات اور ان کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے دی جانے والی سزاؤں اور تنبیہوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

اہل کتاب کے اس مفصل تذکرہ کا کیا مقصد ہے، اس میں مسلمانوں کے لیے عبرت و نصیحت کے کون سے پہلو ہیں؟ اس کتاب میں انہی اہم موضوعات سے بحث کی گئی ہے۔

کتاب پر سکریٹری ادارہ مولانا سید جلال الدین عمری کا مبسوط اور وقیع مقدمہ بھی ہے۔

عمدہ کاغذ، دیدہ زیب سرورق، آفسٹ کی حسین طباعت۔ صفحات: ۲۹۶، قیمت: ۷۰ روپے

ملنے کے پتے: (۱) مکتبہ تحقیق وتصنیف اسلامی، پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ۔ ۱

(۲) مرکزی مکتبہ اسلامی۔ ۱۳۵۳۔ چتلی قبر۔ دہلی۔ ۶